پشتِ پا زن تختِ کیکاؤس را　　سر بدہ از کف مدہ ناموس را [177]
بے نیازی رنگِ حق پوشیدن است　　رنگِ غیر از پیرہن شوئیدن است [178]
آفتاب استی یکے در خود نگر　　از نجومِ دیگراں تابے مخر [179]
تا کجا طوفِ چراغِ محفلے　　ز آتشِ خود سوز اگر داری دلے [180]

(ج) جس طرح اللہ تعالیٰ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ ہے اُسی طرح مسلم رنگ و خون سے بالاتر ہے۔ اسلام میں حسب و نسب، رنگ، قوم، ذات پات، نسل، زبان، دولت ثروت یہ سب ہیچ ہیں۔

فارغ از اُمّ و اب و اعمام باش　　ہمچو سلمانؓ زادۂ اسلام باش [181]
گر نسب را جزوِ ملّت کردۂ　　رخنہ در کارِ اخوّت کردۂ [182]
دل بہ محبوبِ حجازیؐ بستہ ایم　　زیں جہت با یک دگر پیوستہ ایم [183]
رشتۂ ما یک تولّایش بس است　　چشمِ ما را کیفِ صہبایش بس است [184]
عشق در جان و نسب در پیکر است　　رشتۂ عشق از نسب محکم تر است [185]
ہر کہ پا در بندِ اقلیم و جد است　　بے خبر از لَمْ یَلِدْ لَمْ یُوْلَدْ است [186]

(د) وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح کوئی اللہ کا ہمسر نہیں، کوئی قوم مسلمانوں کی بھی ہمسر نہیں۔

رشتۂ با لَمْ یَکُنْ باید قوی　　تا تو در اقوامِ بے ہمتا شوی [187]
آنکہ ذاتش واحد است و لاشریک　　بندہ اش ہم در نسازد با شریک [188]
خرقۂ لَاتَحْزَنُوْا اندر برش　　اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ تاجے بر سرش [189]
پیشِ باطل تیغ و پیشِ حق سپر　　امر و نہی او عیارِ خیر و شر [190]
خوار از مہجوریٔ قرآں شدی　　شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی [191]
اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ　　در بغل داری کتابِ زندۂ [192]

© rasailojaraid.com

(۲۰) عرضِ حالِ مصنّف بحضور رحمۃ للعالمین

اس آخری باب میں علامہ نے سرکارِ مدینہ سے عرض کی ہے کہ حضور! مسلمان حبّ نبی سے بیگانہ ہوگیا ہے اُس نے عرب سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا ہے اور عجمی خیالات عجمی تمدن اور عجمی وضع اختیار کر لی ہے۔ میں نے اُسے قرآن کی طرف بلایا ہے۔

محفل از شمعِ نوا افروختم قوم را رمزِ حیات آموختم [۱۹۳]

لیکن اگر میں نے قرآن کے علاوہ کسی اور شے کی طرف بلایا ہے تو بے شک آپ مجھے جو مرضی ہو سزا دیں۔

گر دلم آئینۂ بے جوہر است ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است [۱۹۴]

پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن ایں خیاباں را ز خارم پاک کن [۱۹۵]

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا [۱۹۶]

اور اگر میں نے قرآن ہی کی طرف بلایا ہے تو میری اتنی درخواست ہے۔

عرض کن پیشِ خدائے عزّوجل عشقِ من گردد ہم آغوشِ عمل [۱۹۷]

سب سے آخر میں علامہ نے سرکارِ مدینہ کے سامنے بڑے ادب کے ساتھ اپنی ایک دلی آرزو پیش کی ہے:

زندگی را از عمل ساماں نبود پس مرا ایں آرزو شایاں نبود [۱۹۸]

ہست شانِ رحمتت گیتی نواز آرزو دارم کہ میرم در حجاز [۱۹۹]

از درت خیزد اگر اجزائے من وائے امروزم خوشا فردائے من [۲۰۰]

کوکبم را دیدۂ بیدار بخش مرقدے در سایۂ دیوار بخش [۲۰۱]

علامہ کی یہ دعا اس قدر رقّت آمیز ہے کہ کوئی صاحبِ دل بغیر چشم تر کیے اُسے ختم نہیں کر سکتا۔

خدا کرے علامہ کی یہ دعا قبول ہو اور علامہ کے علاوہ دیگر عاشقانِ رسولؐ کو بھی یہ سعادت نصیب ہو۔ آمین

('میثاق' جولائی و اگست ۱۹۶۹ء)

سید نذیر نیازی مرحوم

اقبال اور قرآن

(ماخوذ از میثاق جنوری فروری ۵۴ء)

انجمن خدام القرآن کے مؤسس جناب ڈاکٹر اسرار احمد کا ارشاد ہے کہ مسلمانوں پر قرآن مجید کے کچھ حقوق ہیں۔ ایک اسے ماننا، دوسرا پڑھنا، تیسرا سمجھنا، چوتھا عمل کرنا، پانچواں دوسروں تک پہنچانا، پھر ان پانچوں حقوق کو بعنوانات ذیل یوں ترتیب دیا ہے تاکہ ہم سمجھ لیں کہ یہ حقوق فی الواقع ہیں کیا اور باعتبار ان کے ہم پر کیا فرائض عاید ہوتے ہیں۔ عنوانات یہ ہیں:

۱ : ایمان اور تعظیم

۲ : تلاوت اور ترتیل

۳ : تذکّر اور تدبُّر

۴ : حکم اور اقامت

۵ : تبلیغ اور تبیین

ایمان اور تعظیم کا تقاضا یہ ہے کہ ہم قرآن مجید کو صدقِ دل سے مانیں۔ ہر حالت میں اس کے ادب اور احترام کا خیال رکھیں۔ نہ کوئی ہستی اللہ تعالیٰ سے زیادہ واجب التعظیم ہے نہ اُس کے کلام سے بڑھ کر کوئی اور کلام واجبِ تعظیم و تکریم۔

تلاوت و ترتیل سے مراد ہے قرآن مجید کو جملہ آدابِ ظاہری و باطنی اور لوازم تجوید کے ساتھ خوش دلی اور خوش الحانی سے رُک رُک کر اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا تاکہ اس کی تعلیمات ذہن نشین ہوتی جائیں۔ ہم خلوصِ نیت سے ان کے اتّباع اور پیروی پر آمادہ رہیں۔

تذکّر کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کا ہر ارشاد بطور ایک حقیقت ذہن میں مستحضر رہے ہم اسے کبھی نہ بھولیں۔ ہر حالت میں اس سے ہدایت اور رہنمائی حاصل کرتے رہیں۔ تدبّر کے معنی ہیں غور و فکر

© rasailojaraid.com

اور اس سے مقصود یہ کہ ہم ان حقائق کا فہم اور ادراک پیدا کریں جن کی طرف قرآن مجید نے بکمالِ فصاحت و بلاغت جابجا اشارہ کیا۔ بالفاظِ دیگر آیات الٰہیہ کا مطالعہ و مشاہدہ جو انفس و آفاق میں بکھری پڑی ہیں۔ جن کا تعلق جہاں انسان اور کائنات سے ہے وہاں زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں سے بھی ہے تاکہ ہم سمجھیں کہ قرآن مجید کی دعوت کیا ہے۔ ہماری غایت حیات کیا عالم انسانی ہو یا عالم فطرت مشیتِ الٰہیہ اس میں کس طرح کار فرما ہے۔ ہم اپنی کنہ ذات تک پہنچیں۔ یہ جان لیں اسے کائنات اور خالق کائنات سے کیا تعلق ہے۔ اس طریق زندگی میں جو ہمارے لیے تجویز ہوا کیا مصلحت ہے۔ یہ بنیادی سوالات ہیں جن پر انسان ہمیشہ سے غور کرتا چلا آیا اور غور کرتا رہے گا۔ لہٰذا قرآن مجید میں تدبّر اور تفکر بھی ایک ایسا عمل ہے جس کی کوئی انتہا ہے نہ اختتام۔

حکم اور اقامت ہے قرآن مجید کے احکام کی منصفانہ پابندی اور ان سب فرائض کی جو اس طرح عائد ہوتے ہیں ہر حالت میں بجا آوری۔ اقامت وہ جدّوجہد ہے جو اس نظام اجتماع یا معاشرے کے قیام و استحکام میں لازم ٹھہرتی ہے جو قرآن مجید کا مقصود ہے اور جس کی ابتدا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اصولاً اور عملاً ہر پہلو اور ہر جہت سے واضح اور مکمل طور پر کر دی۔

تبلیغ عبارت ہے تعلیماتِ قرآنی کی ہمہ گیر اشاعت سے کہ ان سے دنیا کا کوئی انسان اور کوئی قوم بے خبر نہ رہے اور تبیین یعنی جیسا بھی موقعہ اور جیسے بھی حالات کا تقاضا ہے آیاتِ قرآنی کی توضیح و تشریح۔

آیئے اب ڈاکٹر صاحب کے ان ارشادات کے پیشِ نظر یہ دیکھیں کہ اقبال نے ان حقوق کو کس طرح اور کہاں تک پورا کیا۔

سب سے پہلا فریضہ ایمان اور تعظیم ہے اور اسی سے ایک مسلمان کی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ اقبال نے قرآن مجید کو ویسے ہی مانا جیسے ہر سچے مسلمان کا فرض ہے وہ صدق دل سے اس پر ایمان لائے۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے۔ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے لفظاً اور معناً حضور رسالت مآبؐ پر نازل ہوا اور بعینہٖ آج ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس کی تعلیمات عالمگیر ہیں۔ دوامی اور ابدی، جن میں سرِمو کمی بیشی کی گنجائش نہیں۔ تعظیم کا یہ عالم تھا کہ جہاں قرآن مجید کا ذکر آیا ان کا سر فرطِ ادب سے جھک گیا۔ چہرہ متغیّر ہو گیا۔ بفحوائے "لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ

عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیْتَہٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَۃِ اللّٰہِ"۔ قرآن مجید کی عظمت کا احساس بڑھتا جاتا کسی گہری فکر میں ڈوب جاتے اس عالم میں ان کی دلی کیفیت کا اندازہ انہیں کے اس شعر سے کیجیے جس میں گویا اسی ارشاد باری تعالیٰ لَوْ اَنْزَلْنَا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ ۔۔۔ کی ترجمانی نہایت خوبی سے ہوئی ہے

آنکہ دوشش کوہ بارش برنتافت سطوتِ او زہرۂ گردوں شگافت

تلاوت کا فریضہ تو اس وقت تک جاری رہا جب تک علالت نے انہیں بے بس نہیں کر دیا۔ ان کی تعلیم کا آغاز قرآن مجید سے ہوا اور قرآن مجید ہی پر اس کا خاتمہ ہو گیا۔ بچپن ہی سے نماز فجر کے بعد علی الصبح قرآن مجید کی تلاوت کرتے۔ با ادب بیٹھ جاتے۔ خوش الحان تھے۔ ایک ایک لفظ اور ایک ایک آیت پر غور کرتے۔ ٹھہر ٹھہر کر آگے بڑھتے تاکہ ہر لفظ اور ہر آیت کے معنی ذہن نشین ہو جائیں۔ قرآن مجید کی تلاوت اور مطالعہ ہی ان کا محبوب ترین اور دل و دماغ کا سرمایہ تھا۔ ان کی غذائے رُوح ان کے لیے سرور و ابتہاج کا لازوال سرچشمہ۔ علالت کے ہاتھوں دم کشی اور حبسِ صوت کے باعث جب تلاوت سے معذور ہو گئے تو افسوس فرمایا ؎

لطفِ قرآں سحر باقی نماند

قرآن مجید سے ان کی شیفتگی اور والہانہ شغف کا یہ عالم تھا کہ کوئی بھی مصروفیت ہو، کیسا بھی انہماک گھر بار کے معاملات، دنیا کے دھندے ان کا دل ہمیشہ قرآن مجید میں رہتا۔ دوران مطالعہ ہی اکثر رقت طاری ہو جاتی۔ باآواز بلند تلاوت کر رہے ہیں تو آواز گلوگیر ہے آنکھیں پُرنم۔

تذکر کے لیے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ کوئی گفتگو ہو، تحریر یا تقریر جہاں کوئی بات کہنے کی ہوتی ان کا ذہن بے اختیار ارشادات قرآنی کی طرف منتقل ہو گیا۔ جہاں کوئی حقیقت سامنے آئی کوئی فکر ذہن میں اُبھرا قرآن مجید کے حوالے سے اس کی وضاحت کر دی۔ مثالیں بہت ہیں میں صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا: ۱۹۳۰ء میں الہ آباد میں آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کرتے ہوئے انہوں نے جو خطبہ ارشاد فرمایا، ارضِ پاک و ہند میں ایک آزاد اسلامی قومیت کی تشکیل کا اولین اعلان تھا۔ اسلامی قومیت کی تشکیل اور وہ بھی صدیوں کے زوال و انحطاط، فرقہ آرائیوں اور فرقہ بندیوں کے بعد معمولی نصب العین نہیں تھا۔ اسلامی قومیت کے احیاء اور اسلامی قومیت کے قیام میں خطرے ہی خطرے تھے۔ اندرونی اور بیرونی بھی۔ اس کے لیے شدید جدوجہد، بڑے صبر و استقامت، ایمان کامل اور

© rasailojaraid.com

یقینِ محکم کی ضرورت تھی۔ یہ ایک آزمائش تھی جس میں قرآن مجید ہی سے تمسک اور قرآن مجید ہی کی رہنمائی سے پورے اُتر سکتے تھے۔ لہٰذا اقبال جب سب کچھ کر چکے تو سلسلہ کلام اس ارشاد قرآنی پر ختم کیا۔ عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ۔ اور ظاہر ہے اس موقعہ پر اس سے زیادہ مناسب تنبیہ اور کیا ہو سکتی تھی کہ اگر ہمیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہے ہم راہ ہدایت پر گامزن ہیں تو اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے۔ بعینہٖ ۱۹۲۲ء میں جب عالم اسلام کا سیاسی اجتماعی زوال اپنی انتہا کو پہنچ گیا جب کوئی سرزمین نہیں تھی جہاں مسلمان آزادی کا سانس لے سکے۔ جب ان حالات میں اقبال نے خضرِ راہ کے عنوان سے وہ مشہور نظم جو گویا شمع و شاعر کا تتمہ ہے پڑھی تو اس کا خاتمہ بھی اس ارشادِ باری تعالیٰ پر ہوا۔

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زماں پیشِ نظر لاتخلف المیعاد دار

کون مسلمان ہے جو نہیں جانتا کہ یاس کفر ہے۔ قرآن مجید نے اہل یاس کا شمار اصحاب قبور میں کیا ہے اس دورِ ابتلا میں جب ہر طرف مایوسی ہی مایوسی چھا رہی تھی "لاتخلف المیعاد" سے بڑھ کر امید و اعتماد کا پیغام اور کیا ہو سکتا تھا۔

رہا تدبّر سو اس باب میں کیا عرض کیا جائے۔ محمد اقبال نے جو کچھ کہا جو کچھ سوچا، جو کچھ لکھا، شعر ہو یا فلسفہ قرآن مجید ہی میں تدبّر اور تفکّر کی بدولت۔ اس تدبّر اور تفکّر کی مثالیں پیش کرنا اس کی اہمیت کو کم کرنا ہے۔ یہ تو ایک مستقل موضوع ہے۔ مختصراً یہ کہ اقبال کا سرمایۂ فکر قرآن مجید ہی کی تعلیمات تھیں اور کچھ نہیں تھا۔ ان کی شاعری اور افکار کا بغور مطالعہ کیجئے اس میں قرآن مجید ہی کی روح کارفرما ہے اور قرآن مجید ہی کی ترجمانی مقصود۔ اسرار و رموز اور خطبات کے علاوہ کتنی تحریریں ہیں جن کی اساس قرآن مجید ہی میں ان کا تدبّر اور تفکّر ہے۔ پھر یہی تدبّر اور تفکّر بانگ درا سے لے کر بالِ جبریل، ضربِ کلیم، پیامِ مشرق، زبورِ عجم، پس چہ باید کرد، مسافر اور ارمغانِ حجاز میں ہر کہیں نمایاں ہے۔ بلکہ ان کی متفرق تحریریں، بیانات، تقریریں اور خطوط بھی اس سے خالی نہیں۔ گفتگوؤں میں بات بر پھر کر قرآن مجید ہی کے معارف اور حِکَم پر آجاتی ..... زمانہ طالب علمی ہی میں جب انہیں قرآنِ مجید میں تدبّر اور تفکّر کا سبق دیا جا رہا تھا ان کے والد محترم بھی انہیں یہی نصیحت کرتے۔ ایک روز کہنے

لگے قرآن مجید پڑھتے تو ہو اسے سمجھتے بھی ہو۔ یاد رکھو قرآن مجید پڑھنے ہی سے نہیں دل کے راستے سے بھی سمجھ میں آجاتا ہے۔ اسے پڑھو تو یوں سمجھو جیسے قرآن مجید تمہارے دل پر نازل ہو رہا ہے۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

اس تدبر اور تفکر اور دل کے راستے سے قرآن مجید کو سمجھنے کی داستان بڑی طویل ہے۔ اس کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ میں پھر دو ایک مثالوں پر اکتفا کروں گا۔ ایک روز کہنے لگے فلسفہ ہو یا سائنس، زندگی اور اس کے مسائل، کوئی عقدہ ہو حل ہوتا نظر نہ آئے تو قرآن مجید سے رجوع کرتا ہوں۔ آئن سٹائن کا نظریۂ اضافیت شائع ہوا اور اس کے ماتحت یہ ماننا لازم ٹھہرا کہ کائنات اضافہ پذیر ہے تو میری سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔ کئی دن سوچتا رہا بالآخر ایک روز اس پریشانی میں دفعتہً خیال آیا۔ کیوں نہ قرآنِ مجید سے رہنمائی حاصل کروں۔ میں نے علی بخش کو پکارا، علی بخش قرآن مجید لے آؤ۔ علی بخش قرآن مجید لایا اور میں نے اسے کھولا تو میرے تعجب کی انتہا نہ رہی جب پہلی آیت جس پر میری نگاہ پڑی یہ تھی "وَ اللّٰہُ یَزِیۡدُ فِی الۡخَلۡقِ مَا یَشَآءُ" میں سمجھ گیا۔ میری مشکل حل ہوگئی۔ ایسے ہی نیٹشے کا فوق البشر زیرِ بحث آیا تو میں نے درخواست کی کہ اس باب میں دانستہ یا نادانستہ جو غلط فہمیاں پیدا ہوگئیں یا کر دی گئیں ان کا ازالہ ضروری ہے۔ ناقدین نے فوق البشر کا سلسلہ خواہ مخواہ نائبِ حق سے جوڑ رکھا ہے۔ فرمایا میں تو ان کا کب سے ازالہ کر چکا۔ میں نے جو کچھ کہا ہے میرے ناقدین اسے غور سے کیوں نہیں پڑھتے۔ میں نے عرض کیا میں انہیں کے خیال سے کچھ ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر ان غلط فہمیوں کے پیشِ نظر چند ایک باتوں کی ایک حد تک وضاحت ہو جائے اور وہ بھی آپ کی طرف سے تو اچھا ہو گا۔ فرمایا اگر تمہارا ایسا ہی خیال ہے تو کل سہ پہر کا وقت مناسب رہے گا۔ ذرا جلدی چلے آنا۔ دوسرے روز حاضرِ خدمت ہوا۔ اور کاغذ قلم لے کر بیٹھ گیا تو فرمایا یہ سامنے کی الماری میں قرآن مجید رکھا ہے۔ قرآن مجید اٹھا لاؤ۔ میں اپنے دل میں سمجھ رہا تھا کہ مجھ سے شاید فلسفہ کی بعض کتابوں کی ورق گردانی کے لیے کہا جائے گا۔ میں قرآن مجید لے آیا تو ارشاد ہوا۔ سورۃ الحشر کا آخری رکوع نقل کر لو۔ رکوع نقل کر چکا تو پھر چند ایک عنوانات کے ماتحت یکے بعد دیگرے مختصراً کچھ شذرات لکھواتے گئے یہ دن تھا جب میں پورے طور سے سمجھا کہ اقبال نے نائبِ حق کا جو تصور قائم کیا اس کی اساس

© rasailojaraid.co

فی الحقیقت کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں تدبّر و تفکر کے معنی ہی یہ ہیں کہ علم و حکمت اور فکر و فرہنگ کی ساری دنیا ہمارے سامنے ہو بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ یہ دنیا تمام و کمال ہمارے سامنے آئے گی تو قرآن مجید ہی کی بدولت۔ اس لحاظ سے دیکھا جاتے تو قرآن مجید کا رشتہ علم و حکمت سے جس طرح قائم ہے اور علم و حکمت کا قرآن مجید سے اس کا سمجھنا بہت بڑی بات ہے۔ ایک روز گفتگو تھی کہ اس عہد نے جسے سائنس کا عہد کہا جاتا ہے، مذہب کے بارے میں بڑی بدگمانیاں پیدا کر دیں بلکہ اس کے خلاف ایک معاندانہ روش اختیار کر رکھی ہے۔ فرمایا یہ اس لیے کہ لوگ علم و حکمت کی صحیح روح سے واقف ہیں نہ قرآن مجید سے کہ اس کی تعلیمات کیا ہیں۔ ارشاد ہوا اور انگریزی میں اسلام خلاصۂ کائنات ہے (EPITOME OF THE UNIVERSE) اور یہی رائے ہمارے علماء کی تھی۔ مگر یہ حقیقت جب ہی منکشف ہو گی جب ہم قرآن مجید میں تدبّر اور تفکّر سے کام لیں۔ قرآنِ مجید میں تدبّر اور تفکّر کیجیے تو علم و حکمت ہو یا کوئی اور صداقت ہمارا رشتہ آپ ہی آپ اس سے قائم ہو جائے گا۔ یہ جو اقبال کے اشعار میں تعلیماتِ قرآنی کی برجستہ اور بے ساختہ ترجمانی ہوتی رہتی تھی تو اسی تدبّر اور تفکّر کی بدولت۔ ان کا کہنا تھا کہ قرآنِ مجید ہمیشہ کے لیے ہے۔ اس میں تدبّر اور تفکّر کا عمل بھی ہمیشہ جاری رہنا چاہیے۔

حکم کو لیجیے تو اتنا کہہ دینا کافی ہو گا کہ اقبال کے نزدیک انسان کے لیے کوئی اساسِ فکر اور اساسِ عمل ہے تو قرآنِ مجید اور صرف قرآن مجید۔ حکم کے معنی بہت وسیع ہیں۔ یہ ایک بڑی جامع اصطلاح ہے جس سے مراد ہے ان سب اوامر و نواہی کی غیر مشروط پابندی جو از رُوئے معروف و منکر اور حرام و حلال شریعت نے ہم پر عائد کیے اور جن کی بجا آوری سے فرد کی سیرت اور جماعت کا کردار اسلام کے سانچے میں ڈھلتا ہے جو ہماری تعلیم اور تربیت کا سرچشمہ اور اس عمارت کی اساس ہیں جسے اسلامی نظامِ حیات یا اسلامی طریقِ زندگی یا اصطلاحاً جو جی چاہے کہیے اور جو ساری نوعِ انسانی کو ایک اصول اور قانون پر جمع کرتے ہوئے اس راستے کی طرف لے جاتا ہے جسے اس کی فطرت کہیے جسے خالقِ فطرت نے خود اس کے لیے تجویز کیا۔ مختصراً یہ کہ حکم کا تقاضا ہے اقامتِ دین۔ بالفاظِ دیگر اسلام کی ہر پہلو سے عملاً اور واقعتہً ترجمانی۔ لہٰذا اس معاشرے کی تعمیر جو وحدتِ بشری کی تمہید ہے اور جس کے لیے ایک آزاد اور با اقتدار، مخصوص و متمیز اور جداگانہ سیاسی

اجتماعی گروہ بندی ناگزیر ٹھہرتی ہے، جس کے بغیر ناممکن ہے فرد یا جماعت کی زندگی اسلام کے معیار پر پوری اترے۔ یہی وہ جدوجہد ہے جس میں چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی کی ستیزہ کاری میں ہمارے ایمان اور صبر و استقامت کا امتحان ہوتا ہے اور جس کا، جب ارضِ پاک و ہند کی سیاست ایک فیصلہ کن مرحلے پر پہنچ گئی، وقت آیا اور اقبال نے قوم کو یاد دلایا کہ ہم نہ بھولیں بحیثیت قوم ہمارا فریضہ کیا ہے، ہماری حیاتِ اجتماعیہ اور قومی تشخص کا راز کیا۔ لہٰذا اس مرحلے میں ہمارا موقف کیا ہونا چاہیے تو ان کی مخالفت میں غیروں کی طرف سے جو آواز اٹھی اس میں ایک حد تک اپنوں نے بھی حصہ لیا۔ حالانکہ ان کا کہنا یہ تھا کہ اگر اسلام محض ایک عقیدہ نہیں کہ ہم نے اسے مانا اور اپنی ذاتی اور نجی زندگی سے باہر اس پر عمل سے کنارہ کش ہو گئے بلکہ ایک دستورِ حیات جس کے افہام و تفہیم کے لیے انبیاء علیہم السلام تشریف لاتے جو حضورِ رحمۃ للعالمین کی بعثت کے ساتھ بطور ایک دینِ کامل افراد و اقوام کی زندگی لہٰذا امورِ انسانی میں ہمیشہ کارفرما تھا آج بھی ہے اور رہے گا اگر اس دستورِ حیات کی ترجمانی ایک نظامِ مدنیت کی شکل میں نہیں ہوتی۔ اگر اس کی بنا پر ایک ایسی قوم وجود میں نہیں آتی جس کا ضمیر خالص انسانی اور نقطۂ نظر لسانی، جغرافی، نسلی عصبیتوں سے بالاتر محض انسانیت پر مرکوز ہے تو کوئی بھی جدوجہد ہو سیاسی یا اجتماعی ذہنی یا اخلاقی اس سے کیا حاصل! یہ ایک سیدھی سادی سی بات تھی جس میں کوئی اینچ پیچ نہیں تھا مگر جسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی حالانکہ اس کا مطلب بجز اس کے کچھ نہیں تھا کہ اگر اسلام ایک عالمگیر دعوت ہے، اگر اس کا خطاب ساری دنیائے انسانی اقوام اور اُمم سے اور عالمِ تاریخ سے ہے لہٰذا کسی ایسے نصب العین پر جس سے بحیثیت ایک نوع ہماری تقدیر اور مستقبل وابستہ ہے اور یہی فی الحقیقت تہذیب و تمدن کی اساس۔ اگر مسلمانوں کا کوئی اجتماعی کردار سے کوئی فریضہ ہے جو عالمِ بشری کی ہدایت اور خیر و سعادت کے لیے ان پر عائد ہوتا ہے۔ اگر یہی ہماری زندگی کا مقصد ہے تو ہم اسے آزادی و اقتدار ایک قوم کی حیثیت ہی سے جیسا کہ زبانِ سیاست میں اس کا مفہوم ہے اور جس کے لیے "خیرِ امت" کی تشکیل ہوتی ادا کر سکتے ہیں۔ نہ اسلامی قومیت کسی دوسری قومیت میں ضم ہو سکتی ہے نہ اس کے دستورِ حیات میں کسی دوسرے دستورِ حیات کا پیوند لگ سکتا ہے۔ ہمارا فرض ہے ہم اپنا ملی تشخص قائم رکھیں۔ پھر جب اس ملی تشخص کے شعور ہی سے ہماری تعلیم و تربیت میں کچھ معنی پیدا ہوتے اور ہمارا قومی وجود قائم ہے تو حق و باطل

© rasailojaraid.com

میں شرکت کے کیا معنی۔

باطل دُوئی پسند ہے حق لا شریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

یہ فریضہ ہے جس کی انہوں نے عمر بھر تلقین کی جس کے لیے اپنی ساری زندگی وقف کردی شعر ہو یا فلسفہ ادب اور فن یا سیاسی اور ملی زندگی کا کوئی گوشہ وہ جہاں کہیں بھی اور جس حال میں تھے، اسی نصب العین پر قائم رہے اور یہی اول و آخر ان کی آرزو رہی کہ اُمت اپنے اصل الاصول پر آجائے عصر حاضر کا انسان اپنی سعی و محنت، اپنی عقل و فکر کی تازگی اور علم و ہنر کی نادرہ کاری سے جو دنیا پیدا کر رہا ہے، زندگی نے جو انقلاب انگیز کروٹ لی ہے، ارباب نظر جس نئے اور تابناک مستقبل کا جو خواب دیکھ رہے ہیں مسلمان اس سے غافل نہ رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک موقع دیا ہے اسی میں ان کا امتحان ہے۔ وہ اٹھیں، اپنے ایمان و یقین کی تجدید کریں اور اس دنیا کی تعمیر میں مصروف ہو جائیں جو اسلام کا مقصود ہے۔ لہٰذا جیسے جیسے دن گزرتے گئے ان کی گفتگو کا کوئی موضوع تھا تو یہی اور یہی ہر ایک سے ان کا کہنا تھا کہ علالت کے آخری ایام میں جب ان کے لیے سانس لینا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ انہیں کوئی خیال تھا تو یہی کوئی پریشانی تھی تو یہی۔ چنانچہ یہ انہیں کا ایمان و یقین بصیرت اور فراست تھی کہ ارض پاک و ہند کی بساط سیاست دیکھتے دیکھتے بدل گئی۔ ع

جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

مسلمانوں نے جان لیا ان کے مستقبل کا راز کیا ہے، ان کے لیے صحیح راہ عمل کیا۔

بات طویل ہو رہی ہے کہنا یہ ہے کہ اقبال کا کوئی پیغام تھا تو یہی کہ مسلمان سمجھ لیں ان کی زندگی قرآن مجید سے ہے۔ قرآن مجید میں فکر و نظر سے کام لیں۔ اس کی تعلیمات پر عمل کریں۔ قرآن مجید ہی ان کا ایک سرمایہ ہے یہی ان کا پیغام تھا جسے انہوں نے طرح طرح سے پیش کیا۔ شعر میں، فکر میں تحریر و تقریر میں، گفتگوؤں میں، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، کوئی معاملہ ہو، کوئی مسئلہ، علم و حکمت کی بحث ہو، تہذیب و تمدن یا ادب اور فن، سیاست اور معاش، فرد کی زندگی، جماعت کے مفاد، انسان، اس کے ضمیر اور باطن، احوال و واردات امور عالم کی غرضیکہ کوئی موضوع ہو بالآخر قرآن مجید ہی پر ختم ہوتا۔ قرآن مجید ہی نے ان کے فکر کو جلا دی۔ قرآن مجید نے ہی ان کی شاعری

میں وہ کیفیت، وہ درد و سوز اور ذوق و شوق پیدا کیا جس کا سرچشمہ ایمان میں نے عرض کیا تھا۔ ان کی تعلیم کا آغاز قرآن مجید سے ہوا اور اگر ہم نے اقبال کو سمجھ لیا ہے تو جیسا کہ ہر کوئی سمجھ سکتا ہے اس تعلیم کا خاتمہ بھی قرآن مجید ہی پر ہوا۔ آخری عمر میں بھی ان کی کوئی خواہش تھی تو یہی کہ قرآن مجید کے معارف اور حکم پر قلم اٹھائیں۔ زندگی کے آخری لمحے آئے تو یہی آرزو کہ قرآن مجید سنیں اور ایسا کیوں نہ ہوتا۔ جب زندگی ہو یا آخرت اس کا رشتہ قرآن مجید ہی سے وابستہ ہے انہوں نے کہا ہے اور خوب کہا۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

لیکن اس "بقرآن زیستن" کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس جد و جہد میں جو نوع انسانی کو ازل سے درپیش ہے، جس میں تاریخ کی حیثیت ایک لمحے کی ہے، جس میں اقوام و امم یکے بعد دیگرے ایسے ابھرتی ہیں جیسے کسی بہتی ہوئی ندی میں پانی کے بلبلے، جس میں تہذیب و تمدّن نے کئی رنگ بدلے، چشم فلک نے کئی انقلاب دیکھے اور جس کا سلسلہ اس لیے جاری ہے اور جاری رہے گا کہ انسان اپنے مدّعا و منتہا کو پالے، ہم اس جد و جہد میں مردانہ وار حصّہ لیں۔ اسے اسلام کے قالب میں ڈھال دیں۔ یہ مقصد وعظ و نصیحت اور تحریر و تقریر سے حاصل نہیں ہوگا۔ قرآن مجید پر عمل کرنے سے

اے کہ می نازی بقرآنِ عظیم تا کجا در حجرہ ہا باشی مقیم
در جہاں اسرارِ دیں را فاش کن نکتۂ شرعِ مبیں را فاش کن

یہ اس لیے کہ زندگی کو ثبات ہے۔ اس کی تقویم کا کوئی نسخہ، اس کے امکانات کے حصول کا کوئی راستہ، اس کی غایت اور کنہ میں ادراک کا کوئی ذریعہ ہم سمجھ لیں اس کا رُخ فی الحقیقت کس طرف ہے تو قرآن مجید ہی کی بدولت۔ یہی ہماری تعمیر ذات اور یہی ایک ایسی زندہ و پائندہ شخصیت کی اساس ہے جسے موت کا ہاتھ بھی فنا نہیں کر سکتا۔ قرآن مجید ہی اس محکم اور ترقی پذیر نظام تمدّن کا صورت گر ہے جس کی ساری نوعِ انسانی کو ضرورت ہے۔ وہ ایک عالمگیر اور ابدی پیامِ ہدایت ہے جو ہمارے لیے مژدۂ حیات لے کر آیا جس میں ہمارا ہی ذکر ہے، جسے یاد رکھنے کے لیے آسان کر دیا۔ "وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ فَھَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ" جو عین صداقت ہے، عین علم و حکمت، سراسر دستور و قانون، سراسر موعظت اور رحمت!

© rasailojaraid.com

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم — حکمتِ اُو لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات — بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
حرفِ اُو را ریب نے تبدیل نے — آیہ اش شرمندۂ تاویل نے
نوعِ انساں را پیامِ آخریں — حاملِ اُو رحمۃٌ للعالمین!

اب اگر ہمیں زندگی کی نعمت ملی ہے، ہمارے نزدیک اس کے کچھ معنی ہیں، ہم اس کی تب و تاب محسوس کرتے، اس کے ذوق وشوق اور سوز و ساز کے لذّت آشنا ہیں، ہمارے سینوں میں بھی وہی آرزوئیں اور تمنائیں پرورش پا رہی ہیں، وہی عزائم اور مقاصد اُبھر رہے ہیں جن کا تعلّق جہاں داری اور جہاں بانی سے ہے، عالمِ محسوس کی تسخیر اور ایک برتر تہذیب و تمدّن کے نشو ونما سے، ایک ایسی دنیا کا تصور ہیں جو عمل پر اکسا رہا ہے جس میں انسانیت کا جوہر کھلے، جس میں زندگی کو اس کے سارے جمال و جلال کے ساتھ عالمِ خارج میں مشہور دیکھیں، جس میں نت نئے حقائق اور نت نئے مدارجِ ذات سے لُطف اندوز ہوں تو اس میں کامیابی کا رشتہ قرآن مجید ہی سے جوڑنا پڑے گا۔ پھر اس باب میں اقبال کا خطاب اگرچہ ساری نوعِ انسانی سے تھا لیکن اس شخص سے بالخصوص جو مسلمان ہے اور اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے کہ سب سے زیادہ اسی کا فرض ہے کہ اس جدوجہد میں حِصّہ لے۔

چوں مسلمانان اگر داری جگر — در ضمیرِ خویش و در قرآں نگر
صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست — عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست
یک جہانش عصرِ حاضر را بس است — گیر اگر در سینہ دل معنی رس است
بندۂ مومن ز آیاتِ خدا است — ہر جہاں اندر برِ اُو چوں قبا است
چوں کہن گردد جہانے در برش — می دہد قرآں جہانے دیگرش
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود — جان چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

ہم بھول گئے قرآن مجید ہی سے ہمارا قومی وجود قائم ہے۔ قرآن مجید ہی ہمارے ملّی تشخص کا راز، ہمارا آئین، ہمارے لیے اصول و قوانین کا سرچشمہ۔ مگر ہم ذلیل و خوار ہو گئے۔

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی — شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی

کی تردید ہے جو لقا کے عوض فنا کو انسان کا نصب العین قرار دیتے ہیں۔ یہ مذاہب انسان کو بزدلی سکھاتے ہیں۔ ان مذاہب کی تعلیم یہ ہے کہ مادہ کا مقابلہ کرنے کے بجائے اس سے گریز کرنا چاہیے۔ حالانکہ انسانیت کا جوہر یہ ہے کہ انسان مخالف قوتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرے اور انہیں اپنا خادم بنا لے۔ اس وقت انسان "خلیفۃ اللہ" کے مرتبہ پر پہنچ جائے گا۔

جس طرح خودی کو مرتبۂ اختیار پر فائز کرنے کے لیے ہمیں "مادہ" پر غالب آنا ضروری ہے اسی طرح اسے غیر فانی بنانے کے لیے ہمیں "زمانہ" پر غالب آنا لازمی ہے۔ مرتبۂ بقا وہی شخص حاصل کر سکتا ہے جو اس کے لیے جدوجہد کرے اور اس کا حصول ہمارے افکار اعمال کے ان طریقوں پر منحصر ہے جو خودی کی حالت کاوش پیہم کو برقرار رکھ سکیں۔ بدھ مذہب اور ایرانی تصوف اس حالت کے لیے مفید نہیں ہیں۔

اگر خودی کی حالت کاوش برقرار رہے تو گمان غالب یہ ہے کہ موت کا صدمہ ہماری خودی کو متاثر نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے کہ موت موجودہ زندگی اور آئندہ زندگی کے درمیان ایک وقفہ سکون ہو جسے قرآن شریف عالم برزخ سے تعبیر کرتا ہے۔ موت کا صدمہ صرف وہ افراد برداشت کر سکیں گے جنہوں نے اس زندگی میں اپنی خودی کو پختہ کر لیا ہوگا۔

اگرچہ حیات اپنے ارتقائی منازل میں اعادہ اور تکرار کو پسند نہیں کرتی تاہم جیسا کہ وِلڈن کار نے لکھا ہے حشر اجساد بھی عین قرین عقل ہے۔ زمانہ کو لمحات میں تقسیم کر دینے سے ہم اسے مکان سے وابستہ کر سکتے ہیں اور اسی لیے اس کو عبور کرنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں۔

زمانہ کی حقیقت اس وقت آشکارا ہو سکتی ہے جب ہم اپنی ذات میں غوطہ زنی کریں کیونکہ حقیقی زمانہ خود ہماری حیات ہی ہے۔ ہم زمانہ کے محکوم اسی وقت تک ہیں جب تک زمانہ کو مکان سے وابستہ سمجھتے ہیں۔ مقید بالمکان زمانہ۔ اس زنجیر سے مشابہ ہے جس کو کسی شخص نے اپنے گرد لپیٹ لیا ہو۔ اس زمانہ کو حیات نے اپنے گرد اس لیے لپیٹ لیا ہے تاکہ موجودہ ماحول کو اپنے اندر جذب کر سکے۔ دراصل ہم غیر زمانی ہیں۔ اور موجودہ مقید بالزمان زندگی میں کبھی کبھی

© rasailojaraid.com

اس اپنے غیر زمانی ہونے کا احساس ہو سکتا ہے۔ اگرچہ یہ بالکل آنی ہوگا۔

خودی میں عشق سے پختگی پیدا ہوتی ہے۔ عشق کے معنی ہیں کسی چیز کو اپنے اندر جذب کرنا یا جزو ذات بنانا۔ عشق کی اعلیٰ ترین صورت یہ ہے کہ ایک نصب العین اپنے سامنے رکھا جائے۔ عشق کی خاصیت یہ ہے کہ وہ عاشق اور معشوق دونوں میں شان انفرادیت پیدا کر دیتا ہے۔

جس طرح عشق سے خودی میں پختگی اور توانائی آتی ہے سوال سے ضعف اور نقص پیدا ہوتا ہے۔ جو بات بغیر ذاتی کوششوں کے بغیر حاصل ہو جائے وہ سوال کے ذیل میں آتی ہے۔ چنانچہ جو شخص باپ دادا کے ترکے سے دولت مند بنا ہے وہ دراصل سائل یعنی گدا ہے۔ جو شخص دوسروں کے خیالات کو مدار فکر بناتا ہے وہ بھی سائل ہے ؎

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ بادشاہی

عشق کس طرح کرنا چاہیئے ؟ اس کا جواب ایک مسلمان کے لیے آنحضرتؐ کی زندگی میں موجود ہے۔ اس لیے اللہ نے فرمایا "لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ" آپؐ نے اپنے طرز عمل سے دکھا دیا کہ عشق اس طرح کرتے ہیں۔ پس مسلمانوں کو آنحضرتؐ کا اسوۂ حسنہ اپنے سامنے رکھنا چاہیے۔

ہر کہ عشق مصطفٰےؐ سامانِ اوست
بحر و بر در گوشۂ سامانِ اوست

تربیت خودی کے تین مراحل ہیں (۱) دستور الٰہی کی اطاعت (۲) ضبط نفس (۳) نیابت الٰہی۔

نیابت الٰہی، دنیا میں انسانی ارتقا کی آخری منزل ہے۔ جو شخص اس منزل پر پہنچ جاتا ہے وہ اس دنیا میں خلیفۃ اللہ ہوتا ہے۔ وہ کامل خودی کا مالک اور انسانیت کا منتہائے مقصود اور روح اور جسم دونوں کے لحاظ سے حیات کا بلند ترین مظہر ہوتا ہے یعنی اس کی زندگی میں آ کر حیات اپنے مرتبۂ کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ کائنات کے پیچیدہ مسائل اس کی نظر میں سہل معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اعلیٰ ترین قوت اور برترین علم دونوں کا حامل ہوتا ہے اس کی زندگی میں فکر اور

علم جبلت اور ادراک سب ایک ہو جاتے ہیں۔

چونکہ وہ سب کے آخر میں ظاہر ہوگا اس لیے وہ تمام صعوبتیں جو انسانیت کو ارتقائی منازل طے کرنے میں لاحق ہوتی ہیں برمحل ہیں۔ اس کے ظہور کی پہلی شرط یہ ہے کہ بنی نوع آدم جسمانی اور روحانی دونوں پہلوؤں سے ترقی یافتہ ہو جائیں۔ فی الحال اس کا وجود خارج میں موجود نہیں لیکن انسانیت کی تدریجی ترقی اس امر کی دلیل ہے کہ زمانہ آئندہ میں افرادِ کاملہ کی ایسی نسل پیدا ہو جائے گی، جو حقیقی معنوں میں نیابت الٰہی کی اہل ہوگی۔

زمین پر خدا کی بادشاہت کے یہ معنی ہیں کہ یہاں یکتا افراد کی جماعت جمہوری رنگ میں قائم ہو جائے ان کا صدر اعلیٰ وہ شخص ہوگا جو ان سب پر فائق ہوگا اور اس کا نظیر دنیا میں نہ مل سکے گا۔

نیٹشے نے بھی اپنے تخیل میں افراد یکتا کی ایسی جماعت کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ لیکن اس کے نسلی تعصب نے اس تصویر کو بھونڈا کر دیا۔

(۲)

'اسرارِ خودی'

کے مباحث عالیہ کا مختصر خاکہ

مرتبہ: پروفیسر یوسف سلیم چشتی

علامہ نے اپنے فلسفہ کی جو تشریح فرمائی ہے اس پر اضافہ کرنا میری لیاقت سے باہر ہے لیکن میں ناظرین کی آگاہی کے لیے اسرار خودی کے مباحث کا خلاصہ بیان کرتا ہوں تاکہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے۔

(۱) شاعری علامہ کے لیے مقصود بالذات نہیں ہے۔ ذریعہ اظہار خیالات ہے۔ لکھتے ہیں:

© rasailojaraid.com

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست　　بت پرستی بت گری مقصود نیست [12]

پس جو لوگ اقبال کو محض شاعر تصوّر کرتے ہیں اور اس کے کلام کو عروضی قواعد پر پرکھتے ہیں حقیقت سے ناآشنا ہیں۔ اقبال شاعر نہیں "پیغام گو" ہے۔

(۲)　خودی اصل نظامِ عالم ہے اور تسلسل حیات استحکام خودی پر منحصر ہے۔ کائنات کی ہر شے میں "خودی" موجود ہے۔

چوں حیاتِ عالم از زورِ خودی است　　پس بقدرِ استواری زندگی است [13]

قطرہ چوں حرفِ خودی از بر کند　　ہستیٔ بے مایہ را گوہر کند [14]

(۳)　خودی کی حیات و بقاء تخلیق و تولید مقاصد پر منحصر ہے جس خودی (شخص) کے سامنے کوئی نصب العین نہیں وہ مردہ ہے اس کا عدم و وجود برابر ہے۔

زندگی در جستجو پوشیدہ است　　اصلِ او در آرزو پوشیدہ است [15]

دل ز سوزِ آرزو گیرد حیات　　غیرِ حق میرد چو او گیرد حیات [16]

زندہ را نفیٔ تمنا مردہ کرد　　شعلہ را نقصان سوز افسردہ کرد [17]

علم از سامانِ حفظِ زندگی است　　علم از اسبابِ تقویمِ خودی است [18]

(۴)　خودی عشق سے مستحکم ہوتی ہے۔

از محبت می شود پایندہ تر　　زندہ تر سوزندہ تر تابندہ تر [19]

عشق را از تیغ و خنجر باک نیست　　اصلِ عشق از آب و باد و خاک نیست [20]

خاکِ نجد از فیض او چالاک شد　　آمد اندر وجد و بر افلاک شد [21]

(۵)　عشق کا طریقہ محمدؐ عربیؐ سے سیکھنا چاہیے۔

در دلِ مسلم مقامِ مصطفٰےؐ است　　آبروئے ما ز نامِ مصطفٰےؐ است [22]

آنکہ بر اعداء درِ رحمت کشاد　　مکّہ را پیغامِ لَا تَثْرِیبَ داد [23]

امتیازاتِ نسب را پاک سوخت　　آتشِ او ایں خس و خاشاک سوخت [24]

چوں گلِ صد برگ ما را بو یکیست   اوست جانِ ایں نظام و او یکیست[25]

(۶) بغیر آپؐ کی اتباع کے خودی مرتبۂ کمال کو نہیں پہنچ سکتی۔

عاشقی؟ محکم شو از تقلیدِ یار   تا کمندِ تو کند یزداں شکار[26]
تا خدائے کعبہ بنوازد ترا   شرحِ انی جاعلٌ سازد ترا[27]

(۷) خودی سوال سے یعنی دوسروں کی نقالی کرنے سے ضعیف ہو جاتی ہے اور ترقی نہیں کر سکتی۔

خود فرود آ از شتر مثلِ عمرؓ   الحذر از منتِ غیر الحذر[28]
رزقِ خویش از نعمتِ دیگر مجو   موجِ آب از چشمۂ خاور مجو[29]
تا نباشی پیشِ پیغمبرؐ خجل   روزِ فردائے کہ باشد جاں گسل[30]
ہمت از حق خواہ و با گردوں ستیز   آبروئے ملتِ بیضا مریز[31]

(۸) جب خودی عشق و محبت سے مستحکم ہو جاتی ہے تو نظامِ عالم کو مسخر کر لیتی ہے۔

پنجۂ او پنجۂ حق می شود   ماہ از انگشتِ او شق می شود[32]
در خصوماتِ جہاں گردد حکم   تابعِ فرمانِ او دارا و جم[33]

(۹) مسئلہ نفیٔ خودی اقوامِ مغلوبہ کی ایجاد ہے جس کی وجہ سے اقوامِ غالبہ کے قویٰ ضعیف ہو جاتے ہیں اس لیے اس مسئلہ سے احتراز کرنا لازم ہے۔ یہ مسئلہ ہلاکت کا پیش خیمہ ہے۔

صد مرض پیدا شد از بے ہمتی   کوتہ دستی، بے دلی، دوں فطرتی[34]

(۱۰) افلاطون کے خیالات سے احتراز کرنا واجب ہے کیونکہ اس نے ترکِ عمل کی تعلیم دی ہے اور یہ بات خودی کے لیے مضر ہے۔

بسکہ از ذوقِ عمل محروم بود   جانِ او وارفتۂ معدوم بود[35]
منکرِ ہنگامۂ موجود گشت   خالقِ اعیانِ نامشہود گشت[36]
قومہا از سکرِ او مسموم گشت   خفت و از ذوقِ عمل محروم گشت[37]

© rasailojaraid.com

(۱۱) ادبیات اسلامیہ بھی دیگر شعبوں کے محتاج اصلاح ہیں۔ شعراء اور ادباء کو چاہیے کہ ایسے مضامین پر قلم اٹھائیں جن سے قوم کی مردہ رگوں میں حرکت پیدا ہو۔

ای میاں کیسہ ات نقدِ سخن ــــ بر عیارِ زندگی او را بزن[۳۸]
فکرِ روشن بیں عمل را رہبر است ــــ چوں درخشِ برق پیش از تندر است[۳۹]
فکرِ صالح در ادب می بایدت ــــ رجعتے سوئے عرب می بایدت[۴۰]

(۱۲) تربیتِ خودی کے تین مراحل ہیں۔ اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابتِ الٰہیہ۔

(ا) اطاعت

در اطاعت کوش اے غفلت شعار ــــ می شود از جبر پیدا اختیار[۴۱]
باطنِ ہر شے ز آئینے قوی ــــ تو چرا غافل زایں ساماں روی[۴۲]
شکوہ سنجِ سختیِ آئیں مشو ــــ از حدودِ مصطفٰے بیروں مرو[۴۳]

(ب) ضبطِ نفس

ہر کہ بر خود نیست فرمانش رواں ــــ می شود فرماں پذیر از دیگراں[۴۴]
تا عصائے لا الٰہ داری بدست ــــ ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست[۴۵]
ہر کہ در اقلیمِ لا آباد شد ــــ فارغ از بندِ زن و اولاد شد[۴۶]
می کند از ما سوٰی قطعِ نظر ــــ می نہد ساطور بر حلقِ پسر[۴۷]

(ج) نیابتِ الٰہی

نائبِ حق ہمچو جانِ عالم است ــــ ہستیِ او ظلِّ اسمِ اعظم است[۴۸]
از رموزِ جزو و کل آگہ بود ــــ در جہاں قائم بامر اللہ بود[۴۹]
نوعِ انساں را بشیر و ہم نذیر ــــ ہم سپاہی ہم سپہ گر ہم امیر[۵۰]
مدعائے عَلَّمَ الاسماستے ــــ سرِّ سبحان الذی اسرا ستے[۵۱]
ذاتِ او توجیہِ ذاتِ عالم است ــــ از جلالِ او نجاتِ عالم است[۵۲]

(۱۳) حیاتِ ملّی کا تسلسل روایاتِ ملیہ کی حفاظت و مداومت پر موقوف ہے جو قوم اپنی ملّی روایات سے بے خبر ہو جاتی ہے وہ صفحہ ہستی سے مٹ جاتی ہے پس مسلمانوں کو اپنی ملّی روایات پر قائم رہنا چاہیے۔

اے امانت دارِ تہذیبِ کہن　　پشتِ پا بر مسلکِ آبا مزن [۵۳]

(۱۴) مسلمان کی زندگی کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اور جہاد کا مقصود اگر تسخیر ممالک ہو تو وہ اسلام میں حرام ہے۔

طبعِ مسلم از محبت قاہر است　　مسلم ار عاشق نباشد کافر است [۵۴]
تابعِ حق دیدنش نا دیدنش　　خوردنش، نوشیدنش، خوابیدنش [۵۵]
قربِ حق از ہر عمل مقصود دار　　تا ز تو گردد جلالش آشکار [۵۶]
ہر کہ خنجر بہرِ غیر اللہ کشید　　تیغِ او در سینۂ او آرمید [۵۷]
زندگی از طوفِ دیگر رستن است　　خویش را بیت الحرم دانستن است [۵۸]

(۱۵) موجودہ عقل و خرد اور تہذیب در اصل جہالت اور سفاہت ہے مسلمانوں کو اس مادّی تمدّن اور مغربی تہذیب سے بچنا چاہیے کیونکہ اس کی بنیاد غیر اللہ پر قائم ہے اور اس لیے کمزور ہے۔

علمِ مسلم کامل از سوزِ دل است　　معنیٔ اسلام ترکِ آفل است [۵۹]
سوزِ عشق از دانشِ حاضر مجوے　　کیفِ حق از جامِ ایں کافر مجوے [۶۰]
دانشِ حاضر حجابِ اکبر است　　بُت پرست و بُت فروش و بُتگر است [۶۱]

(۱۶) وقت (TIME) پر وہی شخص حکمران ہو سکتا ہے۔ جو اپنی خودی سے واقف ہو۔ چنانچہ مرشد رومی کہتے ہیں۔

ہر کہ عاشق شد جمالِ ذات را　　اوست سیّد جملہ موجودات را [۶۲]

امام شافعیؒ نے وقت کو سیف قاطع قرار دیا ہے۔ وقت در اصل حیات ہے اور کوئی

© rasailojaraid.co

شخص حیات کو وقت سے جدا کر کے سمجھ بھی نہیں سکتا۔

من چہ گویم سرِّ ایں شمشیر چیست — آب او سرمایہ دار از زندگیست[۶۳]

پنجۂ حیدرؓ کہ خیبر گیر بود — قوتِ او از ہمیں شمشیر بود[۶۴]

تو کہ از اصلِ زماں آگہ نۂ — از حیاتِ جاوداں آگہ نۂ[۶۵]

زندگی از دہر و دہر از زندگی است — لاتسبو الدہر فرمانِ نبیؐ است[۶۶]

نغمۂ خاموش دارد سازِ وقت — غوطہ در دل زن کہ بینی رازِ وقت[۶۷]

(۱۷) آخر میں علامہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ:۔

(ا) عشق را از شغلِ لا آگاہ کن — آشنائے رمزِ الّا اللہ کن[۶۸]

(ب) موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا سینہ دل سے خالی ہے یعنی محمل تو ہے مگر لیلیٰ نہیں ہیں مثلِ شمع کے تنہا جل رہا ہوں کوئی میرا دلسوز نہیں۔ پس اے خدایا تو یہ امانت مجھ سے واپس لے لے یا مجھے ایک ہم دم عطا کر۔

خواہم از لطفِ تو یارے ہمدمے — از رموزِ فطرت من محرمے[۶۹]

تا بجانِ او سپارم ہوئے خویش — باز بینم در دلِ او روئے خویش[۷۰]

****

مولانا محمد طاسین کی معرکۃ الآراء تصنیف

مروجہ نظام زمینداری اور اسلام

عمدہ سفید کاغذ دیدہ زیب طباعت خوبصورت اور مضبوط جلد
قیمت ۳۵ روپے

شائع کردہ: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور، ۳۶۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن

ملّتِ اسلامیہ کے نام اقبال کا پیغام

خلاصۂ رموزِ بے خودی

مرتبہ: پروفیسر یوسف سلیم چشتی

جس طرح خودی کے معنی تکبّر یا غرور کے نہیں ہیں اسی طرح بے خودی کے معنی بے ہوشی یا خود فراموشی کے نہیں۔ بلکہ یہ فرد کی زندگی کی اس کیفیت کا نام ہے جو جماعت کے ساتھ وابستہ رہنے سے پیدا ہوتی ہے۔

(۱) رابطِ فرد و ملّت

علامہ فرماتے ہیں کہ فرد تنہا زندگی بسر کرنے کے لیے نہیں پیدا ہوا۔ جہاں تک ہو سکے جماعت کے ساتھ رہنا چاہیے۔ چنانچہ آنحضرتؐ فرماتے ہیں "شیطان جماعت سے دُور رہتا ہے"۔

فرد می گیرد ز ملّت احترام ملّت از افراد می یابد نظام[۱]

فرد قوم سے جدا ہو کر اپنی ہستی کھو بیٹھتا ہے اور ترقی کی جملہ راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔

ہر کہ آب از زمزمِ ملّت نخورد شعلہ ہائے نغمہ در عُودش فسرد[۲]

انسان کے اندر جوہرِ نوری ہے۔ قوّتِ ادراک اُسی کی ایک شعاع ہے۔ اس کی ترقی جماعت میں رہ کر ہی ہو سکتی ہے۔

فطرتش آزاد و ہم زنجیری است جزوِ او را قوّتِ کُل گیری است[۳]

در جماعت خود شکن گردد خودی تا ز گلبرگے چمن گردد خودی[۴]

(۲) ملّت اختلاطِ افراد سے پیدا ہوتی ہے اور اس کی تربیت کی تکمیل نبوّت سے ہوتی ہے یعنی اللہ تعالیٰ انبیاء کو اس لیے بھیجتا ہے کہ وہ مختلف الخیال افراد کو ایک سلک میں منسلک کر کے قوم بنا دیتے ہیں۔ چنانچہ بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰؑ نے ایک قوم بنا دیا اور عربوں کو سرکارِ مدینہؐ نے

© rasailojaraid.com

محفلِ انجم ز جذبِ باہم است ہستیٔ کوکب ز کوکب محکم است[۷۵]

نبیؐ افراد کو یوں مخاطب کرتا ہے۔

گویدش تو بندۂ دیگر نۂ زیں بتان بے زبان کمتر نۂ[۷۶]

اس کے بعد انہیں ایک سلک میں منسلک کرتا ہے۔

تا سوئے یک مدعایش می کشد حلقۂ آئیں بپایش می کشد[۷۷]

نکتۂ توحید باز آموز دش رسم و آئینِ نیاز آموزدش[۷۸]

(۳) ارکانِ اساسی (BASIC PRINCIPLES OF ISLAM)

(ل) اسلام کا رکنِ اوّل توحید ہے ۔ یہ اسلام کا امتیازی نشان ہے۔ اور اسلام کا سارا فلسفہ اسی توحید میں مضمر ہے۔

عقلِ انسانی اسی توحید کی بدولت منزلِ مقصود تک پہنچ سکتی ہے۔ ورنہ اس بے چاری کو ساحل کہاں مل سکتا ہے۔ مومن میں دین حکمت آئین زور قوت اور تمکین سب توحید کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ جب مسلم حقیقی معنی میں خدائے واحد کا پرستار ہو جاتا ہے تو کیا ہوتا ہے[۷۹]

بیم وشک میرد عمل گیرد حیات چشم می بیند ضمیرِ کائنات[۷۹]

چوں مقامِ عبدہٗ محکم شود کاسۂ دریوزہ جامِ جم شود[۸۰]

ملّتِ اسلامیہ کے لیے توحید بمنزلۂ روحِ رواں ہے۔ اگر توحید کا تصوّر خارج کر دیا جائے تو ملّتِ اسلامیہ لاشۂ بے جان رہ جائے گی۔

ملّتِ بیضا تن و جاں لا الٰہ ساز ما را پردہ گرداں لا الٰہ[۸۱]

لا الٰہ سرمایۂ اسرارِ ما رشتہ اش شیرازۂ افکارِ ما[۸۲]

چونکہ اسلام کا خدا ایک ہے اس لیے ملّتِ اسلامیہ کا مقصود بھی ایک ہی ہونا چاہیے۔

ملّت از یک رنگیٔ دلہاستے روشن از یک جلوہ ایں سیناستے[۸۳]

قوم را اندیشہ ہا باید یکے در ضمیرش مدّعا باید یکے[۸۴]

مسلمان کو حسب و نسب پر نازاں نہیں ہونا چاہیے اِنَّ اَکرَمَکُم عِندَ اللہِ اَتقٰکُم

برنسب نازاں شدن نادانی است ۔۔۔ حکم او اندر تن و تن فانی است ۸۵

ملتِ مارا اساسِ دیگر است ۔۔۔ ایں اساس اندر دلِ ما مضمر است ۸۶

ما ز نعمت ہائے او اخواں شدیم ۔۔۔ یک زبان و یک دل و یک جاں شدیم ۸۷

(۳) ب : یاس و حزن و خوف اُمّ الخبائث ہیں اور حیات کے دشمن ہیں توحید پر اگر کامل ایمان ہو تو ان امراض کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ انسان کو لازم ہے کہ کبھی نا اُمید نہ ہو کیونکہ نا اُمیدی حیات کے لیے سامانِ مرگ ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا تَقنَطُوا مِن رَّحمَۃِ اللہِ

اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر ۔۔۔ از نبی تعلیم لَا تَحزَن بگیر ۸۸

قوّتِ ایماں حیات افزایدت ۔۔۔ وردِ لَا خَوفٌ عَلَیھِم بایدت ۸۹

بیم غیر اللہ عمل را دشمن است ۔۔۔ کاروانِ زندگی را رہزن است ۹۰

ہر شرِ پنہاں کہ اندر قلبِ تست ۔۔۔ اصل او بیم است اگر بینی درست ۹۱

ہر کہ رمزِ مصطفیٰ فہمیدہ است ۔۔۔ شرک را در خوف مضمر دیدہ است ۹۲

خوفِ حق عنوانِ ایمان است و بس ۔۔۔ خوفِ غیر از شرکِ پنہان است و بس ۹۳

(۴) رکنِ دوم رسالت : جس چیز کی توحید کے بعد ضرورت ہے وہ ایمان بر رسالت ہے۔ رسالت پر ایمان لانے سے تنِ مردہ میں جان آجاتی ہے اور دین و آئین کی بنیاد رسالت ہی ہے۔ رسول صلعم مسلم کے قلب و جگر کی قوّت ہوتا ہے اور خدا سے بھی زیادہ پیارا ہوتا ہے کیونکہ وہ ہمیں خدا تک پہنچاتا ہے۔ اس کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دینا مسلمان کے لیے موت کا حکم رکھتا ہے

سرکارِ مدینہ نے ہمیں دینِ حق اور مذہبِ فطرت عطا کیا اور اس لیے کہ ہماری وحدت میں کوئی تفرقہ پیدا نہ ہو اور ہماری ہستی ابدی ہو جائے۔ خدا نے ہمارے رسول صلعم پر رسالت ختم کردی

قوّتِ قلب و جگر گردد نبیؐ ۔۔۔ از خدا محبوب تر گردد نبیؐ ۹۴

دینِ فطرت از نبیؐ آموختیم ۔۔۔ در رہِ حق مشعلے افروختیم ۹۵

لَانَبِیَّ بَعْدِیْ ز احسانِ خداست　　پردۂ ناموسِ دینِ مصطفیٰ است[96]

(۴) ب: رسالتِ محمدیؐ کا مقصد یہ ہے کہ دنیا میں انسانوں کے اندر حریت و اخوت و مساوات قائم ہو جائے۔

آنحضرتؐ کی بعثت سے پہلے انسان انسان پرست تھا۔ آنحضرتؐ نے دنیا کو حریت و اخوت و مساوات کا سبق پڑھایا۔

کُلُّ مُؤمِنٌ اِخوَۃٌ اندر دلش　　حریت سرمایۂ آب و گلش[97]

ناشکیبِ امتیازات آمدہ　　در نہادِ او مساوات آمدہ[98]

اس کے بعد علامہ نے تاریخ اسلامی سے ان تینوں کی مثالیں دی ہیں۔ حریت کی مثال میں امام حسینؓ کی شہادت پیش کی ہے۔

بہرِ حق در خاک و خوں غلطیدہ است　　پس بنائے لا الٰہ گردیدہ است[99]

ما سوا اللہ را مسلماں بندہ نیست　　پیشِ فرعونے سرش افگندہ نیست[100]

رمزِ قرآں از حسینؓ آموختیم　　ز آتشِ او شعلہ ہا اندوختیم[101]

رمزِ قرآں سے علامہ کی مراد یہ ہے کہ مسلمان کو ہر حال میں باطل کا مقابلہ کرنا چاہیے اور اگر ضرورت پڑے تو جان دینے سے دریغ نہ کرنا چاہیے۔

(۵)　چونکہ ملتِ محمدیؐ کی بنیاد توحید اور رسالت پر ہے اور یہ حقائق محدود فی المکان نہیں ہیں اس لیے ملتِ محمدیؐ بھی محدود فی المکان نہیں۔ اس لیے:

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا　　مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

مسلم استی دل باقلیمے مبند　　گم مشو اندر جہانِ چون و چند[102]

دل بدست آور کہ در پہنائے دل　　می شود گم ایں سرائے آب و گل[103]

آنحضرتؐ نے اپنے وطن سے ہجرت کر کے مسلم کی قومیت کا عقدہ حل کر دیا۔ مدینہ کو وطن بنا لیا جو آپؐ کا جائے ولادت نہیں تھا۔ یعنی تمام دنیا مسلمان کا وطن ہے اور تمام زمین

اس کے لیے مسجد ہے۔

ہجرت آئین حیات مسلم است — ایں ز اسبابِ ثبات مسلم است[۱۰۴]

صورتِ ماہی بہ بحر آباد شو — یعنی از قیدِ مقام آزاد شو[۱۰۵]

ہر کہ از قیدِ جہات آزاد شد — چوں فلک در شش جہت آباد شد[۱۰۶]

(۶) وطن اساسِ ملت نہیں ہے۔ وطنیت کے عقیدہ کو علامہ مسلمان قوم کے لیے ازبس مضر خیال کرتے ہیں کیونکہ اس کی بنا پر اخوت کا زریں اصول تباہ ہو جاتا ہے جو لوگ ملت کی تعمیر وطنیت کے اصولوں پر کرتے ہیں وہ نوعِ انسان کے ساتھ دشمنی کرتے ہیں۔ دنیا میں جو کچھ ہنگامہ بپا ہے اور ایک قوم دوسری قوم کے خون کی پیاسی نظر آتی ہے وہ اسی وجہ سے ہے۔ اساسِ ملت وطن نہیں بلکہ مذہب ہے۔

تا سیاست مسندِ مذہب گرفت — ایں شجر در گلشنِ مغرب گرفت[۱۰۷]

روح از تن رفت و ہفت اندام ماند — آدمیت گم شد و اقوام ماند[۱۰۸]

(۷) جس طرح ملتِ محمدیؐ محدود فی المکان نہیں اسی طرح مقید بالزمان بھی نہیں۔ اگرچہ فرد و ملت کی اجل مقرر ہے اور ملت بھی فرد کی طرح مردہ ہو جاتی ہے لیکن ملتِ محمدیؐ اجل سے محفوظ ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نے اس ملت کی بقا کا خود وعدہ فرمایا ہے۔

امتِ مسلم ز آیاتِ خداست — اصلش از ہنگامہ قَالُوا بَلٰی ست[۱۰۹]

از اجل ایں قوم بے پرواستے — استوار از نَحْنُ نَزَّلْنَا ستے[۱۱۰]

تا خدا اِنْ یُّطْفِئُوْا فرمودہ است — از فسردن ایں چراغ آسودہ است[۱۱۱]

(۸) نظامِ ملت کسی ضابطہ کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا اور اس لیے خدا نے نظامِ ملت کے قیام و ثبات کے لیے قرآن پاک نازل فرمایا ہے۔ پس اگر مسلمان اپنا ملی نظام استوار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں قرآن کو اپنا دستورِ حیات اور ضابطۂ عمل بنانا چاہیے۔

ہستی مسلم ز آئین است و بس — باطنِ دینِ نبیؐ ایں است و بس[۱۱۲]

© rasailojaraid.com

الغرض تقلید کے معنی ہیں قرآنی احکام کی بے چون وچرا تعمیل کرنا اور یک آئینی کو اپنا نصب العین بنانا۔ سنتِ نبویؐ پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہنا اور ہر معاملہ میں قرآن سے فیصلہ طلب کرنا۔

(۱۰) اتباعِ آئینِ الٰہیہ سے سیرتِ ملّی میں پختگی پیدا ہوتی ہے۔ یہ عنوان حرزِ جاں بنانے کے لائق ہے۔ فرماتے ہیں کہ قرآن وہ ہیرا ہے جسے خود اللہ تعالیٰ نے تراشا ہے۔ اس میں سراسر نور اور روشنی ہے اس کا ظاہر بھی موتی ہے اور باطن بھی موتی ہے۔ اس کا ظاہر و باطن دونوں ایک ہے۔ علمِ حقیقت شریعت سے جدا نہیں ہے اور سنّت کے معنی یہ ہیں کہ آنحضرتؐ سے محبت کی جائے۔ "ہر کہ عشقِ مصطفیٰؐ الخ" اگر مسلمان اپنے ایمان کو مضبوط اور شاداب رکھنا چاہتے ہیں تو اتباعِ شریعت کریں۔ ملّت کا نظام اتباعِ شریعت پر مبنی ہے۔ جب یہ نظام محکم ہو جاتا ہے تو ملّت کو دوام نصیب ہو جاتا ہے۔ لوگ اسلام کا "راز" SECRET پوچھتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ شریعت ہی اسلام کا راز ہے۔

اگر کوئی قوّت اتباعِ شریعت میں مزاحم ہو تو اس کا مقابلہ کرنا فرض ہے۔

سرّ ایں فرمانِ حق دانی کہ چیست؟ زیستن اندر خطرہا زندگیست[126]

آنحضرت صلعم کا دین زندگی بخشنے والا دین ہے۔

ہست دینِ مصطفیٰؐ دینِ حیات شرعِ اُو تفسیرِ آئینِ حیات[127]

جب سے مسلمانوں نے شعارِ نبویؐ سے روگردانی کی رمزِ بقا سے محروم ہو گئے۔

تا شعارِ مصطفیٰؐ از دست رفت قوم را رمزِ بقا از دست رفت[128]

آخر میں نصیحت کی ہے کہ عجمی خیالات سے پرہیز کرو کیونکہ وہ حدودِ اسلام سے تجاوز کرنا سکھاتے ہیں۔ عرب سے الفت پیدا کرنا چاہیے۔

با مریدے گفت اے جانِ پدر از خیالاتِ عجم باید حذر[129]
زانکہ فکرش گرچہ از گردوں گذشت از حدِ دینِ نبیؐ بیروں گذشت[130]
قلب را زیں حرفِ حق گردان قوی با عرب در ساز تا مسلم شوی[131]

© rasailojaraid.co